خلیفہ صاحب کی نظر میں اسلام اور ارتقاء کا توافق

کمال محمد حبیب

اگرچہ ارتقاء کا تصور نیا نہیں لیکن ارضیات سے لے کر حیاتیات ، نفسیات ، عمرانیات ، معاشیات بلکہ اخلاقیات اور مذہبیات تک میں اس کا اطلاق ہمارے اس جدید دور کو گذشتہ ادوار سے ممیز و ممتاز کرتا ہے ۔ مگر ارتقاء کے اس ہمہ گیر اطلاق نے انسانوں کے لئے بعض ایسی اشکال پیدا کر دی ہیں جن سے نبرد آزما ہوئے بغیر نظر و عمل ، قدر اور واقعہ ، ماضی اور مستقبل کے درمیان کوئی رابطہ مستحکم صورت میں قائم نہیں کیا جا سکتا ۔ عام فہم الفاظ میں اس مسئلے کو ہم ارتقاء اور مذہب کے توافق کا مسئلہ کہتے ہیں ۔ خلیفہ صاحب نے اس کے ضمن میں گراں قدر علمی خدمات انجام دی ہیں جن کا جائزہ لینا اس کاوش کا موضوع ہے ۔

کائنات کی ساخت اور اس کے ارتقاء کے بارے میں جو جدید انکشافات ہوئے ہیں وہ انسان کے سان و گمان سے بھی پرے ہیں ۔ کائنات کے زمان و مکان کی وسعت انسان کے حسّی تخیل میں سما ہی نہیں سکتی ۔ سچ تو یہ ہے کہ تورات کا باب تخلیق اور یونانیوں کی کونیاتی موشگافیاں محض بچوں کے تخیلات معلوم ہوتے ہیں ۔ پتہ چلا ہے کہ ہمارا نظام شمسی کوئی آزاد نظام نہیں ہے بلکہ ایک کہکشانی نظام کا حقیر جزو ہے جس کے مرکز کے چاروں طرف ہمارا سورج گردش کرتا رہتا ہے جو اس کہکشاں میں ایک اوسط درجے کا تارا ہے ۔ اس کہکشاں میں کم از کم ایک ہزار کروڑ سورج اور ہیں۔ ہمارے اس کہکشانی نظام کی صورت بیضوی شکل کی ہے اور اس کی کمیّت سورج سے ہزار ارب زیادہ ہے جب کہ سورج کی کمیّت زمین سے تین ہزار گنا زیادہ ہے ۔

مزید برآں یہ کہکشاں پوری کائنات کہاں ، اس کائنات میں ایک سنگ ریزہ کے برابر بھی نہیں ۔ دو سو انچ کی دوربینوں سے کوئی ایک ہزار کروڑ سے زیادہ کہکشاں کا اب تک شمار کیا جاچکا ہے ۔

کائنات کے زمان و مکان کا اندازہ کچھ اس امر سے ہو گا کہ زمینی پیمانے اس کو ناپ نہیں سکتے۔ شعاع نور کی شرح رفتار جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے کائناتی فاصلہ کی اکائی کے طور پر استعمال ہوتی ہے ۔ ہمارے کہکشانی نظام کی وسعت اتنی ہے کہ اس کے طولانی فاصلہ کو طے کرنے میں روشنی ایک لاکھ سال لیتی ہے اور اس کے عرض پر دونوں نقاط کے درمیان کا فاصلہ اسی ہزار سال میں طے کرتی ہے ۔ نیز یہ کہ ہماری کہکشاں سے قریب تریں

دوسری کہکشاں کا فاصلہ طے کرنے میں روشنی کو چھ لاکھ اسی ہزار سال درکار ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ اوپر گزرا اب تک ایسی ایک ہزار کروڑ کہکشانیں دریافت ہو چکی ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ اس قدر غیر محدود کائنات کی تشکیل کیسے ممکن ہوئی ہے ؟ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کہکشاں ابتدا میں سحابیہ ہوتی ہے ، یعنی ایک دخان یا بادل کی طرح گیسی مادہ ۔ پھر یہ رفتہ رفتہ سکڑتی ہے اور مختلف منزلوں سے گزر کر تکمیل کو پہنچتی ہے یہاں تک کہ اس میں اربہا ارب سورج نمودار ہوتے ہیں۔ پھر ان سورجوں کے تابع سیارے وجود میں آتے ہیں جیسے مریخ ، زہرہ ، زمین ، زحل ، مشتری ، وغیرہ ہیں ۔ رفتہ رفتہ یہ کہکشاں پرانی ہو جاتی ہے ۔ سورجوں کے توابع اپنے اپنے سورجوں کی طرف واپس آنے لگتے ہیں اور ان میں جا کر گر جاتے ہیں ۔ پھر سورج یا تو بے نور ہو جاتے ہیں یا پھٹ جاتے ہیں ۔ آخر پوری کہکشاں پھٹ جاتی ہے اور کائناتی بادل میں تحویل ہو کر فضائے بسیط میں منتشر ہو جاتی ہے ۔ دوربینوں سے مختلف مدارج کی کہکشانوں کا پتہ چلا ہے ۔ ان میں ایسی کہکشانیں بھی نظر آتی ہیں جو ابھی سحابیہ کے درجے میں ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اس درجہ سے آگے بڑھ چکی ہیں اور وہ بھی جو اپنے پورے ارتقا پر پہنچ چکی ہیں اور ایسی بھی ہیں جن پر قیامت گزر چکی ہے ۔ قرآن مجید میں جب قیامت کا بیان آیا تھا تو اس وقت مفکرین اس کا مذاق اڑاتے تھے ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ماہرین طبیعیات کائنات کو ایک میکانکی نظام سمجھتے تھے جس کی ساخت یکساں ہے اور جس میں زیر و زبر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن جب دوربینوں سے کائنات کو بنتے اور بگڑتے دیکھا گیا تو قرآنی الہامات کی تائید ہوتی ہے اور سورج کا سوا نیزہ پر آ جانا برحق معلوم ہوتا ہے ۔ قرآن مجید میں قیامت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ محض ایک تخیل و افسانہ نہیں ۔ آج کل کے انکشافات کی روشنی میں یہ ایک زندہ حقیقت ہے جس کی تصدیق فلکیاتی تحقیق سے روز بروز ہوتی رہتی ہے ۔ پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہونا ، روئی کے گالوں کی طرح اڑنا ، اور احتراق کی شدت ، ان جوہری دھماکوں کا قریب ترین بیان ہیں جو مختلف کہکشانوں میں ہوتے رہتے ہیں ۔

ارتقا میں ایام کا ایک خصوصی پیمانہ درکار ہے ۔ ہمارے رات اور دن صرف زمین کے مظاہر ہیں ۔ حد زمین سے باہر خلا میں بلکہ نظام شمسی کے اند سفر تک میں یہ بے قیمت ہو جاتے ہیں ۔ نظام شمسی سے باہر تو یہ بالکل بے معنی ہیں ۔ خیال کیجئے کہ جب بات نظام شمسی سے بڑھ کر کہکشانی نظام اور ان کے درمیان زمان و مکان کے فاصلوں کی ہو تو واقعی ان میں مفہوم بھی کیا رہ جاتا ہے ؟ یہ لازمی امر ہے کہ کہکشانی ایام ، نظام شمسی کے

ایام سے مختلف ہوں اور خود نظام شمسی کے ایام زمین کے ایام سے مختلف ہوں - اسی طرح کل کائنات کے ایام بھی ہر کہکشان کے ایام سے مختلف ہوں - جدید تحقیقات ان انکشافات تک بدیہی طور پر پہنچا دیتی ہیں - قرآن شریف ان تحقیقات کا پورا پورا ساتھ دیتا ہے - خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''کلام پاک کے قاری کے لئے یہ امر پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہیے --- کلام پاک واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں وقت انسانی وقت سے قطعی مختلف ہے - ایک جگہ آتا ہے کہ اللہ کا ایک دن ہمارے ہاں کے ایک لاکھ برس کے مساوی ہے '' ۱ - حشر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس کا ایک دن تم لوگوں کے شمار کے موافق ایک ہزار سال کے برابر ہے (۳۲،۵) - خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ امر ملحوظ رکھنا مناسب ہوگا کہ ان اعداد سے وقت کا ایک نپاتلا حساب مقصود نہیں ہے بلکہ تمثیلی زبان میں ایک طویل مدت کی شباہت سے انسانی ذہن کو مانوس کرنا مقصود ہے ۲ - کلام پاک اپنے بیانات سے انسان کے ذہن کو اس طرف مبذول کردیتا ہے کہ کائنات کے مختلف مدارج میں دوران وقت مختلف ہے - چنانچہ اسی کائنات میں ایسے نظام موجود ہیں کہ ہمارے ہزاروں برس گذر جاتے ہیں لیکن وہاں کا ایک دن بھی پورا نہیں ہوتا - قرآن شریف میں جہاں کہا گیا ہے کہ زمین اور آسمانوں کو خدا نے چھ دن میں بنایا اور پھر وہ اپنے عرش قائم ہوگیا ، اس کی تشریح اسی طرح کی جائے گی کہ یہ چھ دن کائناتی ایام ہیں جن سے ہمارے ایام کو کوئی نسبت نہیں ۳ - قرآن کے اس بیان سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق یک بیک نہیں ہوئی - یہ تخلیق مدارج سے گذرتی ہے جس کا اندازہ تعداد ایام سے کیا جاسکتا ہے - زمینوں اور آسمانوں کی تکوین گویا چھ ارتقائی منازل سے گذرتی ہے - خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ کائنات کا ارتقائی تصور قرآن شریف کے بیان تخلیق کو دیگر صحف کے بیانات سے ممیز و ممتاز کرتا ہے - انہوں نے سورۂ انبیاء کی چند آیات کا حوالہ دیا ہے جس میں ارشاد ہے کہ ''کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بستہ (بند) تھے تو ہم نے دونوں کو شگافیہ کیا (کھول دیا) اور ہم ہی نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا'' (۲۱،۳۰) -

ان آیات سے یہ بات شعور انسانی کے سامنے منور ہوتی ہے کہ آسمان ایک بند وجود تھا، اللہ نے اس میں انشقاق پیدا کیا - آجکل تخلیق کائنات کے جو

۱- Khalifa Abdul Hakim, ''Evolution'' (an unpublished paper)

۲ - ایضاً

۳ - ایضاً

سائنسی نظریے ہیں وہ دو متبادل راہوں پر گئے ہیں ۔ ایک نظریہ فشاری (explosive) کہلاتا ہے اور دوسرا استقراری (steady) ۔ اول الذکر نظریے کے بموجب تمام کائنات ایک جوہر (atom) میں مرتکز تھی جو کائناتی توانائی کا بند خزانہ تھا۔ اس کے اندر انشقاق واقع ہوا۔ توانائی چاروں طرف نکل کر پھیل گئی ۔ پھر آہستہ آہستہ اس توانائی میں سکون آنا شروع ہوا جس سے گیسی بادلوں کا وجود ہوا ۔ یہ بادل اور ٹھنڈے ہوئے جن سے رفتہ رفتہ کہکشاں وجود میں آئے ۔ کیا قرآن شریف کی مندرجہ بالا آیت میں اس نظریے کی طرف واضح اشارہ نہیں ہے؟ کائنات کی تخلیق کا دوسرا نظریہ استقراری ہے جس کے بموجب کائنات میں تخلیق وحدت کا سلسلہ مسلسل ہے۔ کسی نامعلوم مرکز سے توانائی مسلسل وجود میں آتی ہے جس سے سحابیہ یعنی کائناتی بادل بنتے ہیں، پھر اپنی ارتقاء کی منازل طے کرکے کہکشانوں، سورجوں کی صورت میں نمودار ہوکر رفتہ رفتہ سکڑ کر اور پھٹ کر یہ فنا ہوجاتے ہیں، فنا ہونے پر پھر '' سحابیہ '' یا کائناتی بادل وجود میں آتا ہے ۔ یہ سلسلہ لگاتار ہے ۔ توانائی فساد کا شکار ہوکر پھر کون میں نمودار ہوتی ہے ۔ اس کے بعد سحابیہ کی شکل میں نمودار ہونے کے لئے یہ تشبیہ کتنی محاکاتی ہے کہ آسمان بند تھا پھر رب نے اس میں شگاف کیا ۔

زمین کے بارے میں بھی قرآن شریف کا ارشاد ہے کہ خدا نے اسے شگافیہ کیا اور اس طرح زمین میں سے مختلف انواع و اقسام کے جمادات اور نباتات کا ظہور ہوا ۔ اگر کل کائناتی تخلیق پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایک ناقابل شکست سلسہ معلوم ہوتا ہے جس میں کہیں رخنہ نہیں ہے ۔

خلیفہ صاحب اپنے نظریہ ارتقاء میں وحدت کائنات پر زور دیتے ہیں۔ ان کے فلسفہ میں پوری تخلیق ایک واحد سلسلہ ہے ۔ چونکہ خالق ایک ہے اس لئے تمام تخلیق میں وحدت ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ '' قرآن پاک ہمیں اس کا درس دیتا ہے کہ زندگی ایک زنجیر کی طرح ہے جو کہیں سے ٹوٹی ہوئی نہیں ہے ۔ غیر نامیاتی مادہ نامیاتی مادے میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور نامیاتی مادہ سے نفس یا ذہن وجود میں آتا ہے '' [۲] ۔

قرآن شریف کی ان تعلیمات پر ، جن کی نشان دہی خلیفہ صاحب کرتے ہیں، دور حاضرہ کے فلسفہ سائنس کی اساس قائم ہے۔ سائنسی اسلوب کے مطابق ذہن کی تشریح نامیاتی تعاملات سے اور نامیاتی تعاملات کی تشریح غیر نامیاتی تعاملات سے اور ان کی تشریح عالمگیر طبعی قوانین سے کی جاتی ہے ۔ ان تشریحات سے کائنات کی سائنسی تعبیر حاصل ہوتی ہے جو اس کی کلی تعبیر میں ایک اہم مقام کی ضرور حامل ہوتی ہے ۔

دور جدید کی لیچریت کا سب سے بڑا مخمصہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی اس

---

(۲) ایضاً ۔

تعبیر سے مطمئن ہوجاتی ہے ۔ حالانکہ خود اسی تعبیر کے اندر اعلیٰ تر تعبیر کے اجزا پوشیدہ ہیں اور کائنات اپنی پوری نمود میں ایک روحانی سلسلہ معلوم ہوتی ہے ۔

خلیفہ صاحب قرآن شریف کے بیانات سے اس سلسلہ کو واضح کرتے ہیں۔ جدید حیاتیات کا بنیادی انقلاب '' انتخاب فطری '' کے قانون کی دریافت ہے ۔ خلیفہ صاحب اس '' انتخاب فطری '' کو کسی اتفاق پر محمول نہیں فرماتے ۔ وہ اس کو قدرت کے ایک ایسے مسلمہ اصول کی کارفرمائی قرار دیتے ہیں جس کا انکشاف قرآن مجید فرماتا ہے : '' اسی نے آسمان سے پانی برسایا ، پھر اپنے اپنے انداز سے نالے نکلے ۔ پھر پانی کے ریلے پر پھولا ہوا جھاگ (پھین) آگیا ۔ اور اس چیز پر جسے وہ لوگ کوئی زیور یا سامان بنانے کی خاطر آگ میں جلاتے ہیں اسی طرح جھاگ آجاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ یوں حق و باطل کی تمثیل بیان کرتا ہے ۔ جھاگ غائب ہوجاتا ہے اور جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ امثال بیان کرتا ہے '' (۱۳،۱۷) ۔

اس ارشاد کی بابت خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں ایک مثال قدرتی تغیرات سے اور دوسری مثال فن سے لی گئی ہے ۔ جس طرح فن انتخاب کرتا ہے اسی طرح سے قدرت بھی انتخاب کرتی ہے ۔ جھاگ میں ایک رمق پانی سے مشابہت ضرور ہے لیکن اس میں از خود یہ صلاحیت نہیں کہ وہ پیاس بجھاسکے ۔ اور نہ ہی اس میں زندگی کو فروغ دینے کی قدرت ہے ۔ اس طرح سے پھین تو الگ ہوجاتا ہے لیکن پانی باقی رہتا ہے ۔ بعینہ دھات کو پگھلانے میں اس مادہ کو جس کی ضرورت باقی نہیں رہتی الگ کردیا جاتا ہے اور اس طرح دھات خالص صورت میں الگ ہوجاتی ہے [۵] ۔

خلیفہ صاحب اس تشریح سے واضح کرتے ہیں کہ قدرتی ارتقا میں قانون یہ ہے کہ جو شئے ناکارہ ہو وہ فنا ہوجاتی ہے اور جو چیز بار آوری کی صلاحیت رکھتی ہے یا مفید ہو وہ ٹھہری رہتی ہے یا باقی رہ جاتی ہے ۔

خلیفہ صاحب اس مفہوم کو آیات تنسیخ سے اور زیادہ عمیق بناتے ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ خود آیات تنسیخ کی اس نئی معنویت کو اجاگر کرکے خلیفہ صاحب نے علم تفسیر کی بھی خدمت کی ہے ۔ مفسرین نے یہ خیال آرائی کی ہے کہ آیات منسوخہ کا موضوع وہ احکامات الٰہی ہیں جن کو منسوخ کردیا گیا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ تنسیخ کی ان آیات کے موضوع کو محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ تنسیخ ایک عالمگیر اصول ہے جس کو قرآن مجید یوں واضح کرتا ہے : '' ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا مٹادیتے ہیں تو اس سے

---

(۵) ایضاً ۔

بہتر یا ویسی ہی آیت نازل کردیتے ہیں '' (۲،۱۰۶) -

آیت سے مراد '' نشانی '' ہے - کلام الٰہی بھی آیت الٰہی ہے اور خود بموجب قرآن مجید کائنات کی ہر شئے بھی آیت الٰہی ہے - چنانچہ یہ آیت ایک عالمگیر اصول کو واضح کرتی ہے کہ جب کوئی چیز فنا ہوجاتی ہے تو اس سے بہتر یا ویسی ہی چیز نمودار ہوجاتی ہے - یہ اصول کونیاتی ہے - حیاتیاتی ، تاریخی، روحانی غرض تمام واقعات پر محیط ہے -

قرآن مجید کے ان ارشادات سے ارتقاء کے جو قوانین مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱- کائنات میں ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری ہے - ۲- جب کوئی چیز فنا ہوجاتی ہے تو ویسی ہی چیز یا اس سے بہتر چیز اس کی جگہ لے لیتی ہے - اور ۳- ایک چیز اس وقت فنا ہوتی یا غائب ہوجاتی ہے جبکہ وہ بے کار ہوتی ہے اور کوئی وظیفہ انجام نہیں دے سکتی- بالفاظ دیگر جب کوئی شئے مدفضول میں شمار ہونے لگتی ہے تو وہ فنا ہوجاتی ہے -

ارتقاء کے ان عالمگیر اصولوں کی روشنی میں تقدیر انسانی کا تجزیہ کرنا بہت اہم ہے- یہ امر بالکل واضح ہے کہ تخلیق نوع انسانی کائناتی ارتقاء سے کوئی مختلف یا ممیز چیز نہیں - قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ انسان کو کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (۱۵،۲۶)- ایک جگہ آیا ہے کہ لیس دار کیچڑ سے بنایا ہے - انسان اسی کائنات کے ارتقاء کا ایک ثمرہ ہے- حیات کے نمود کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ حیات پانی پر نمودار ہوئی (۲۴،۴۵) - جدید حیاتیاتی تحقیقات بھی اس کی نشاندھی کرتی ہیں- ' لیس دار کیچڑ ' نامیاتی ترکیب کی تمثیل ہوسکتی ہے اور کھنکتی مٹی ارضی ارتقاء کی اس سے بھی کہیں اول منازل کی نشاندھی کرتی ہے جبکہ زمینی مادہ ابھی سیال اور آتشیں تھا - رفتہ رفتہ اس میں کھنک پیدا ہو رہی تھی -

(۲)

خلیفہ صاحب قرآن مجید میں میلاد آدم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ '' انسان کی تخلیق کی بابت جو ارشادات کلام پاک میں ہیں وہ بیحد اہم ہیں- جو فرق کلام پاک اور توراۃ میں اس مسئلے میں ہے وہ در حقیقت انسانوں کے متعلق اسلامی عقائد کی ترجمانی کرتا ہے - کونیاتی قوتیں انسان کی میلاد کی مخالف تھیں چونکہ ان کو یہ خدشہ تھا کہ انسان اپنے آزاد ارادے کا غلط استعمال کرے گا اور اپنے معبود کو بھول جائے گا - یہ تحفہ جس کو ہم آزاد ارادہ کہتے ہیں اور مخلوقات کو بھی دیا گیا تھا لیکن ان سب نے اس کے استعمال سے معذرت چاہی، چونکہ اس میں بے انتہا خطرات مضمر تھے ، لیکن انسان اس مقام کو پہنچ گیا جہاں فرشتے قدم رکھتے ہوئے گھبراتے تھے- مگر قدرت کے

کارخانے میں قانون کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ انسان کا ارتقائی سفر جو اس کو جبلت سے خرد کی طرف لے جاتا ہے خدائے تعالیٰ کے انسان کی صلاحیتوں پر کامل بھروسے کا نتیجہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی نوع مقصود تھی جو علم کے ذریعے سے جہالت کے وسیع دریا کو پاٹ دے اور اپنی آزادی کے صحیح استعمال سے اپنے آزاد ارادے کو خدا کی مرضی کے حوالے کردے'' ۶ ۔

خلیفہ صاحب نے یہاں فرشتوں کے اعتراض کو جو انہوں نے میلاد آدم کے سلسلے میں کیا تھا تمثالی انشاء پر محمول فرمایا ہے ۔ فرشتوں کو ورائے سہ ابعادی وجود تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت سے فرشتوں سے مراد کونی قوتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ میں پہلے بھی اس امر کا ذکر کرچکا ہوں کہ انسان کے لئے تو تین ابعاد ہی ہیں لیکن اس سے اور زیادہ ابعاد نظریاتی طور پر ممکن ہیں اور وائٹ ہیڈ کا قول تو یہ ہے کہ ۳۳ ابعاد ممکن ہوسکتے ہیں ۔ خلیفہ صاحب نے فرشتوں کے لئے Cosmic forces کا لفظ استعمال کیا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا وجود ہمارے ابعادی تصور حیات سے ماورا ہے ۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ و لو انشاء لجعلنا منکم ملائکتہ فی الارض یخلفون ۔ '' اگر ہم مناسب سمجھتے تو تم ہی کو فرشتے بنا کر اس زمین میں تمہارا جانشین نافذ کردیتے''۔ علامہ مشرقی نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''انسان کا اپنی موجودہ حالت سے بہتر مخلوق بننے کے متعلق قرآن عظیم میں ایک خفیف سا اشارہ ہے ۔ یہاں منکم کے الفاظ نہایت قابل لحاظ ہیں ۷ ''۔

ایک دور ایسا تھا جب انسان اپنے ماحول سے بیگانہ تھا اور انسان اور اس کے ماحول میں باہمی افتراق تھا ۔ اس وقت تک اس کی عقل جبلت تک محدود تھی اور اس نے آلہ خود کا استعمال نہیں سیکھا تھا ۔ وہ اپنے ماحول سے خوفزدہ تھا اور اس ماحول سے اپنی زندگی کو محفوظ کرنے کی غرض سے وہ غاروں سے زیادہ باہر آنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا ۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ افتراق دور ہونے لگا اور ہراسانی کے بادل چھٹنے لگے ۔ اقبال نے اس سلسلے میں ایک نہایت بسیط رائے پیش کی ہے ۔ اس نظریے کے مطابق یہ امر لازمی نہیں کہ کلام پاک میں جو ارشادات میلاد آدم کے متعلق ہیں وہ انسان کی پہلی مرتبہ دنیا میں موجودگی کی وضاحت کرتے ہوں بلکہ ان کا مقصد اس دور کی توجیہ سے ہے جب کہ انسان اور اس کے ماحول میں باہمی انشقاق تھا ۔ موجودہ دور کا انسان ماحول پر قابو پانے کی کوشش میں منہمک ہے لیکن قدیمی ادوار میں انسان اس سے بے حد خائف تھا۔ لیکن جب انسان شعور اور آزاد ارادہ کے ہتھیار استعمال

۶۔ ایضاً ۔

۷۔ علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی، تذکرہ، ص ۱۶

کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ آپ ہی آپ مدنیت کے دور میں قدم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد مرضی کا انکشاف اقبال کے نظریہ کے مطابق انسان کو شجر ممنوعہ کی طرف لے گیا۔ تورات کے مطابق تقصیر کی مجرم صرف حضرت حوا تھیں جنہوں نے ابلیس کے بہکانے اور ورغلانے سے حضرت آدم کو بھی اس تقصیر میں شامل کرلیا۔ قرآن میں صاف طور پر ارشاد موجود ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں اس تقصیر میں شامل تھے۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کا مقصد انسانی تمدن کی ایک ارتقائی منزل کی نشاندھی فرمانا ہے، مدنیت میں عورت اور مرد دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اس منزل سے اس عظیم دور کی ابتدا ہوتی ہے جس میں انسان خود اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے اور خود اس کو اپنا بار آپ اٹھانا ہے۔ یہی جلاوطنی ہے اور اسی جلاوطنی سے انسان اعلیٰ و ارفع مدارج پاسکتا ہے۔

خلیفہ صاحب اور اقبال دونوں ہی کی یہ رائے ہے کہ حضرت آدم سے مراد لازمی طور پر پہلے انسان نہیں، بلکہ اس انسان سے ہے جس نے خرد اور آزاد ارادہ کا پہلی مرتبہ استعمال کیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ حضرت آدم کو ابتدا میں ایک نہایت مشکل ماحول کا سامنا کرنا پڑا لیکن در حقیقت یہ عقوبت حضرت آدم کو اپنی تقصیر کی بنا پر نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ کے اور انسان کے آئندہ فائدے کی غرض سے دی گئی تھی۔ اس کا مقصد شیطان کے اس فاسد منصوبے کو ختم کرنا تھا جو وہ انسان کے خلاف اپنے ذہن میں رکھے ہوئے تھا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ''انسان کی محدود خودی کی پرورش اور اس کی بالیدگی کے لئے مخالف ماحول درکار ہوتا ہے۔ خودی جو کچھ تجربہ حاصل کرتی ہے اس کے کئی راستے ہیں اور اس کے ارتقا و فروغ کا راز سعی پیہم میں مضمر ہے۔ اس سعی میں تقصیر اور غلطی دونوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ غلطی جس کو ہم ایک ذہنی گناہ تصور کر سکتے ہیں انسان کی تجرباتی تخلیق کا ایک لازم و ملزوم جزو ہے''۔[۸]

اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن میں وہ اسطوریاتی عنصر جو تورات و انجیل کے باب تخلیق میں پایا جاتا ہے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کی تاویل اس طرح کی گئی ہے کہ وہ ہمارے ذہنی ابواب میں نہایت لطیف طور پر سما سکتا ہے۔ تورات میں کہا گیا ہے کہ خدا کو شام کے وقت حضرت آدم اور حضرت حوا کی اس تقصیر کا علم ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خالق ارض و سما کو علم واقعہ کے بعد ہوا اور اس پر ناراض ہو کر اس نے حضرت آدم اور حضرت حوا کو جنت سے نکال دیا لیکن قرآن میں اس قسم کا کوئی اشارہ

۸ - Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.120

موجود نہیں جس سے خدا کا علم اس قدر محدود ظاہر ہو۔

بہر حال قصہ آدم و حوا کی تشریح اقبال اور خلیفہ صاحب انسانی ارتقا' کی ابتدائی منزل کی طرف اشارت سے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں آدم سے مراد کوئی واحد فرد یا بشر نہیں ہے بلکہ نوع انسانی مراد ہے۔ تقصیر کا مشہور واقعہ انفرادی ارادہ کے استعمال کی طرف اشارہ ہے۔ خدا کا قصور معاف کرنا اور انسان کو اپنی مرضی سے یا خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے روانہ کرنے سے مراد انسانی نوع کے ارتقا' کی اس منزل کا آغاز ہے جہاں سے تہذیب و تمدن کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس تاویل کو ارتقا' اور مذہب کے اندر موافقت پیدا کرنے کی ایک کوشش ہی کہا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں ایک اور کوشش ہوئی ہے جو میرے خیال میں حیاتیاتی ارتقا' اور قرآنی ارشادات میں بہتر موافقت پیدا کرتی ہے۔ یہ نئی کوشش سبط نبی نقوی صاحب نے کی ہے جس کے مطابق آدم سے مراد نوع انسانی نہیں ٹھہرتی بلکہ پہلے واحد انسان ٹھہرتے ہیں [۹] قرآن کا یہ تصور کہ آدم و حوا پہلے افراد انسانی ہیں نقوی صاحب کے نظریے کے مطابق حیاتیاتی ارتقا' کے تصور کے عین موافق ہے۔ نقوی صاحب کے اس نظریہ سے قرآن عظیم کے اس ارشاد کی بھی کہ انسان کو خدا نے نفس واحد سے پیدا کیا ہے، تائید ہو جاتی ہے۔ نقوی صاحب کہتے ہیں کہ تقلب ایک حیاتی قانون ہے اور ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق ایک ایسے حیوان سے ہوئی ہو جو انسان سے کمتر ہو اور قرآن کے '' نفس واحد '' سے وہی مراد ہو۔ اگر اس نظریے کو مان لیا جائے تو حضرت آدم کی وہ تمثیلی حیثیت جو خلیفہ صاحب اور اقبال نے تعین کی ہے باقی نہیں رہتی اور آپ کو پہلا انسان تصور کیا جا سکتا ہے۔

خلیفہ صاحب اپنے تصور' ارتقا' میں واضح کرتے ہیں کہ انسان کے مدنی ارتقا' کے بارے میں بھی قرآن کے بیانات میں اہم علمی خزانے پوشیدہ ہیں۔ طوفان نوح ایک اہم تمدنی منزل کی نشاندھی کرتا ہے۔ گارڈن چائلڈ (Gordon Childe) کہتا ہے کہ طوفان نوح کا جو ذکر قدیم عہد نامہ میں مذکور ہے وہ '' شاعرانہ ہے اور اس کی بنیاد حقیقت پسندی پر کم ہے [۱۰] ''۔ تاہم طوفانی مطروحات (Flood deposits) عراق کے مختلف مقامات میں پائے گئے ہیں جن میں اور دارچ' شروپک اور کش قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ایریدو کے مقام پر سب

۹۔ Sibti Nabi Naqvi, ''Quranic Cosmology,'' Iqbal Review, October 1965.

۱۰۔ V. Gordon Childe, New Light on the Most Ancient East, pp.10-11.

سے قدیم مندر جس کو طوفان نوح سے قبل کا تصور کیا جاتا ہے دریافت ہوا ہے۔

یہ بحث کہ طوفان نوح عالمی تھا یا محدود ایک ایسی بحث ہے کہ جس کے لئے مختلف تاریخی و بشریاتی شہادتیں درکار ہیں جو فی الوقت ہمارے پاس نہیں ہیں۔ کلام پاک میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح کی قوم نے آپ کے پیغام کو ماننے سے ہی قطعاً انکار کر دیا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت نوح جو اخلاقی روایات اپنی قوم کی سرشت میں داخل کرنا چاہتے تھے اس میں آپ کو ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ جب حضرت نوح کو بشارت دی گئی کہ آپ اور دیگر مخصوص بندے طوفان کی زد سے محفوظ رہینگے تو آپ نے خدا سے کہا کہ آپ کی قوم کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اس لحاظ سے خواہ طوفان عالمی تھا یا محدود، وہ انسان کو ایک ارتقائی منزل پر لے جانے کا پیش خیمہ ضرور تھا۔ حضرت نوح کا کشتی بنانا ہی انسانی ترقی کی ایک دلیل ہے۔ سورہ المومنون میں جو واقعہ مذکور ہے اس سے کلام پاک کے ان ارشادات کی توجیہ ہو جاتی ہے جہاں فرمایا گیا ہے کہ جو قوم اپنے آپ میں ترقی کی طرف گامزن ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی اس کا تباہ ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ حضرت نوح کی قوم نے یہی کیا اور جب تباہی کی طرف رخت سفر باندھ لیا تو وہ لازمی طور پر تباہی کی سزاوار ہو گئی۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ تمدنی ارتقاء کی دوسری منزل کی نشاندھی قرآن شریف حضرت ابراھیم کے واقعات سے کرتا ہے۔ حضرت ابراھیم کی بعثت ایسے دور میں ہوئی تھی جب کہ مظاہر پرستی نے آلہ پرستی کو کم و پیش بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس آلہ پرستی میں قربانی کے رسوم اور عمل عبادت گذاری اور نذر و نیاز کا لازمی جزو بن چکے تھے۔ چنانچہ دوشیزاؤں اور بے گناہ بچوں کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ خلیفہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراھیم نے بچے کی قربانی کو جانور کی قربانی سے بدل کر ثقافت میں ایک عظیم الشان انقلاب کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور وہ یہ کہ محبوب حقیقی انسانوں سے محبت کرتا ہے اور اپنی بھینٹ چڑھوانا پسند نہیں فرماتا۔ انسانی قربانیوں کے اس عالمگیر دور میں حضرت ابراھیم کا بیان ایک نئے مذھبی ارتقاء کی ترجمانی کرتا ہے جس میں وحدت الٰہی کے ساتھ رحمت الٰہی کے مذھبی شعور کا اصلی عنصر بن گئی۔ نبوت نے حضرت ابراھیم کے بعد جو ارتقاء پذیر صورت اختیار کی اس کو سنت ابراھیم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کے بعد جتنے انبیا آئے وہ دین ابراھمی ہی سے موسوم ہوئے۔ حضرت ابراھیم کی آزمائش کے سلسلے میں خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ جس حکم کو آپ نے خدا کا حکم تصور کر لیا تھا وہ در حقیقت اس مذھب کا عنصر

تھا جس میں انسانی ربانی کا شائبہ موجود تھا اور خدائے تعالیٰ اس قدر سنگین فرمان کبھی اپنے پسندیدہ بندے کو نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے ایک اسقدر عزیز بیٹے کو قربانی کی بھینٹ چڑھادے۔ حضرت ابراھیم نے جو ایمان کا راستہ اختیار کیا وہ یقیناً آپ کی عظمت کی شہادت دیتا ھے ۔ ویسے غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی خدائے تعالیٰ کی ودیعت تھی ورنہ بے شمار انسان سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھ چکے ہوں گے لیکن کتنوں کو خدا کی عظمت کا اعتراف اس حقیقت سے ہوا تھا ؟ حضرت ابراھیم ایک نبی کی حیثیت سے خدائے تعالیٰ کا پیغام بنی نوع انسان کے لئے لائے تھے ورنہ یوں تو بہت سے مفکرین گذرے ھیں جنہوں نے خدا کے وجود پر شہادت دی ھے ۔ مگر خالق کا ایک مبہم سا تصور ھی کافی نہیں ھے ۔ ایک پیغمبر کو تو خدا کی راہ میں ھر قسم کی صعوبت سے نبرد آزمائی کرنا پڑتی ھے اور اس کا پایہ ان سب آزمائشوں سے بالا تر ھوتا ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ حضرت ابراھیم کو نبیوں میں اس قدر افضل مقام حاصل ھے ۔

خلیفہ صاحب نے اس ضمن میں جو مذکورہ زاویہ نظر اختیار کیا وہ ان کے اس نظریے پر مبنی ھے جس میں خدا کی خصوصیات میں رحمت کو وہ سب سے افضل درجہ دیتے ھیں ۔ چنانچہ خلیفہ صاحب یہ تصور کرنے کو تیار ھی نہیں ھیں کہ خدا حضرت ابراھیم کو اس قدر سخت حکم دے سکتا تھا ۔ خلیفہ صاحب اسی باب میں ینگ (Jung) کے اجتماعی لا شعور (Collective Unconsious) کا حوالہ دیتے ھوئے فرماتے ھیں کہ حضرت ابراھیم کا وجدان ایک ایسی ارتقائی حیثیت کا حامل تھا جو آپ کو انبیاء میں ایک نہایت خاص اور ممتاز مقام تک لے جاتا ھے ۔ مگر دوسرے نظریے سے دیکھا جائے تو یہ بھی خدا کی بے پایان رحمت تھی کہ حضرت ابراھیم نے اس کا فرمان بھی پورا کیا اور حضرت اسماعیل کو آنچ تک نہ آئی ۔

مشہور عبرانی فلسفی مارٹن بیوبر (Martin Buber) اس ضمن میں رقمطراز ھے کہ اگامنون (Agamemnon) جو یونانی اسطوریات ، ادبیات اور ڈراماؤں میں ایک خاص درجہ رکھتا ھے ، اپنی بیٹی آفی جینیا (Iphigenia) کو اپنے ملک کے لئے قربان کرنے کو تیار ھوجاتا ھے ۔ اس کے بر عکس حضرت ابراھیم جو " ایمان کے سپہ سالار " تھے اس منزل کو پار کر لیتے ھیں ۔ کر کے گارڈ (Kierkegaard) حضرت ابراھیم کے متعلق کہتا ھے کہ " ایمان کا سپہ سالار اپنے آپ کو اس دنیا میں اکیلا پاتا ھے ۔ جو کچھ وسائل اس کے پاس ھیں وہ اس کے اپنے ھیں اور یہی امر انتہائی خوفزدہ ماحول پیدا کر دیتا ھے ۔ "[11]

سینٹ پال انسانوں کو دو اقسام میں تقسیم کرتے ھیں : ایک تو معمولی

---

11 Martin Buber, Eclipse of God, p.116

انسان اور دوسرا روحانی فرد (Pneumatic man) جس کو خدا ایک روحانی قوت عطا کر دیتا ہے گو کہ بظاہر وہ اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔

سطور بالا میں میں نے خلیفہ صاحب سے اختلاف کیا ہے لیکن خلیفہ صاحب یہ فرمانے میں قطعاً حق بجانب ہیں کہ چوپایوں کی قربانی بذات خود ارتقائے انسانی کی ایک زبردست شہادت پیش کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنے آپ کو توہمات کے سلاسل سے آزاد کرا رہا تھا۔ آگے چل کر خلیفہ صاحب فرماتے ہیں: ''یہ حضرت ابراہیم کے وجدانی مذہب کی تکمیل تھی کہ قرآن حکیم کے ارشادات میں آنحضرت صلی اللہ وعلیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اہل یہود کی خواہش تھی کہ آپ ان کے اصولوں پر چلیں اور عیسائی خواہشمند تھے کہ آپ ان کے اصولوں یعنی تثلیث، اصل گناہ اور توبہ کو اپنائیں۔ کلام پاک نے آنحضرت کو ہر دفعہ مخاطب کیا: اے رسول! ان سے کہدے کہ تو ابراہیم کا پیرو ہے جو نہ یہودی تھا اور نہ عیسائی۔ عبرانیت اور عیسائیت دونوں نے حضرت ابراہیم کی وحدت کو ایک غلط شکل دے دی تھی اور تمام جلیل القدر اسرائیلی انبیاء کاہنان اسرائیل کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتے رہے، چونکہ اس رجعت پسندی نے مذہب کو اخلاق سے جدا کر دیا تھا[۱۲]''۔ مگر بہرحال میلاد آدم سے اس دور تک انسان بے شمار ایسے ادوار سے گذر چکا ہے جن میں کچھ اس کے لئے تاریک تھے، لیکن مجموعی طور پر وہ ارتقاء کی طرف مائل رہا ہے۔ اسی ترقی اور فروغ کے بارے میں مولانا رومی فرماتے ہیں:

هفت صد هفتاد قالب دیده ام همچو سبزه بارها روئیده ام

خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا ویسے ویسے نبیوں کا بعث ہونا بھی کم ہوتا گیا۔ مثلاً یہ کہ حضرت نوح کے بعد حضرت صالح اور حضرت ہود مبعوث کئے گئے۔ قوم لوط پر بھی اس لئے تباہی آئی کہ وہ حیاتیاتی قوانین سے کھلی خلاف ورزی پر اتر آئے تھے اور اس سے افزائش نسل خطرے میں پڑ گئی تھی۔ حضرت سلیمان کے بعد نبیوں کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ اور رسول اکرم کے درمیان ۵۷۰ سال کا فرق ہے۔ لیکن حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت دانیال کے درمیان اتنا فرق نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے جیسے انسان ترقی کی طرف راستہ اختیار کرنے لگا، مواصلات بہتر ہوتے گئے اور قوموں کے مابین آمد و رفت کے وسائل بہتر ہوتے گئے، نبیوں کے پیغامات بھی مختلف اقوام تک زیادہ موثر طریقے سے پہنچتے رہے۔ حضرت نوح سے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ

۱۲ - Khalifa A. Hakim, '' Evolution. ''

کے زمانے تک صورت یہ رہی کہ پیغامات یا تو اکثر یکسر فراموش کر دئے جاتے تھے یا ان کو غلط روایات میں تبدیل کر دیا جاتا تھا ۔ خلیفہ صاحب کے بقول ان سب حالات کے پیش نظر ہم یہ اس استنباط کر سکتے ہیں کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا ، نبیوں کا ظاہر ہونا بھی کم ہوتا گیا ۔ آنحضرت کے مبعوث ہونے تک یہ سلسلہ ارتقاء کی طرف مائل تھا لیکن حضور سرورکائنات نے اس سلسلہ انبیاء کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ۔ اللہ تعالی کے جو کچھ احکامات کلام پاک میں مذکور ہیں اس ارتقائی منزل کی تائید کرتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت کے زمانے میں انسان ترقی اور ارتقاء کی ایسی نہج پر پہنچ گیا تھا کہ وہ مستقبل کی منازل خود تعین کر سکتا تھا اور اللہ تعالی کے مزید احکامات کی ضرورت اس کو قرآن حکیم کے بعد نہ رہی ۔ اس طرح سے حضور اکرم نے نبیوں کے پیغامات کو اور احکامات الہی کو کلام پاک کے ذریعہ سے پایہ تکمیل تک پہونچا دیا ۔